خواب
عذاب
ہوئے
حسن
عباس
رضا

خواب عذاب ہوئے

۱۹۷۵ء–۱۹۸۵ء

خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

(غالبؔ)

خواب عذاب ہوئے

حسن عباس رضا

احوال

کلام: ——————— خواب عذاب ہوئے

شاعر: ——————— حسن عباس رضا

سرورق: ——————— سلیمہ ہاشمی

خطاطی: ——————— ایچ اے۔ رشید

موسم اشاعت: ——————— ساون، بھادوں ۱۹۸۵ء

تعداد: ——————— ایک ہزار

ناشر: ——————— احمد داؤد۔ ظہیر الدین احمد

مطبع: ——————— فرخ پرنٹنگ ورکس، راولپنڈی

قیمت: ——————— پینتالیس ۴۵ روپے

زیر اہتمام

ظہیر ایسوسی ایٹس۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۱۴ جی پی او۔ راولپنڈی

امّی

بہن

اور

بینا کے نام

ترتیب

حسن عباس رضا — اردو شاعری کا آنگری ینگ مین

حدیثِ نبوی ہے کہ ظلم ہو تو احتجاج کرو، نہ کر سکو تو دل سے ضرور اس کو برا بھلا کہو۔ شاعروں کے نصیب میں دونوں طرح کے عذاب ہیں۔ منہ سے کہنے کے بھی اور دل سے محسوس کرنے کے بھی۔ یہ اُن قیدیوں کی طرح ہوتے ہیں جو اپنی غلیظ کوٹھڑیوں میں دیواروں کو کالا کر کے اپنے مقدروں کی سیاہی دھونے کی کوشش کرتے ہیں۔

سارتر کا خیال تھا کہ اگر فرد کے پاس دنیا کو بتانے اور دکھانے کا کوئی ہنر ہے تو پھر اپنی قوتیں، دوسرے پیشوں پہ ضائع کر کے مجرمانہ حرکت نہ کرے، بلکہ دنیا میں دوسروں کو سچ بولنا سکھائے۔ پاکستانی ادیب بلکہ تیسری دنیا کا ادیب اپنے آپ کو دوسرے پیشوں پر ضائع کرنے پر مجبور ہے گویا وہ خود کو قاتل ہونے کے نام سے نہیں بچا سکتا۔ بقول یوجین آئنسکو:۔

"اگر ہم اس زمانے میں ہوتے کہ جب تشدد، ظلم اور جبر نہ ہوتا تو ہم بور ہو جاتے۔ المناک زندگی کے تواتر اور پیشہ ورانہ مطمحِ نظر کے علاوہ زندگی میں اور کچھ نہ ہوتا سستی اور غصہ میری ناممکنات کے اشارے ہیں۔"

کسی سے مقابلہ کرنے کی خواہش، اور حالات سے خوفزدہ نہ رہنے مگر متحارب رہ کر بھی کچھ نہ کر سکنے کی بے چینی، سراب اور حقیقت کے پلڑوں میں ہمیں تولتی رہتی ہے۔ پہلے شاموں کی گلیاں زیادہ آباد اور کم اندھیری ہوتی تھیں۔ اب گلیاں کم آباد اور زیادہ اندھیری ہوتی ہیں۔ محسوس اس لیے ہوتا ہے کہ ہم سوچتے ہیں مگر کیا کبھی سوچتے ہیں کیا گائیں بھی سوچتی ہیں؟

گائیوں جیسی نسل — تیسری دنیا کے لوگ، اُن کی آواز کم آتی ہے۔ ان کے گلے میں پڑی گھنٹی کی آواز زیادہ زور سے آتی ہے اس آواز کو محبت، رحم، خوف، تکالیف اور حیرانیوں کے

تمام تر خلائق کو ملبوس شعر کرتے ہوئے، یہ گایوں جیسی نسل' اس چراگاہ کی تلاش میں ہے کہ جہاں اپنے جیسے خصلت زادسے مل سکے۔ اپنی بقا کے لیے رزق حاصل کر سکے اور اپنے وجود کو اپنی ٹانگوں پہ کھڑا محسوس کر سکے۔

یہ خصلت زاد کہاں چلے گئے کیا کشتیوں میں بٹھا کر اور کشتیوں کے ساتھ پتھر باندھ کر انہیں ڈبو دیا گیا یا پھر ہنسنے، رونے، چیخنے، آنکھ جھپکنے یا کچھ کرنے کی ساری کوششیں نیست و نابود کر دی گئیں۔ اوکتاویو پاز نے ایسے ہی مرحلے پر ہماری رفاقت کرتے ہوئے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا۔

> انسان اور تاریخ کے درمیان وہی رشتہ ہے جو آزادی اور غلامی کے درمیان ہوتا ہے کہ اگر ہم تاریخ کے مابعد ہیں تو ہم ہی اس کا ضمیر اور ہم ہی اس کا شکار ہیں، کہ اس کا جہنم۔ ہماری قیمت لیکر ہی بھر سکتا ہے۔ شاعری اسی رشتے کو انتہائی جاذب طور پر منقلب کرتی ہے۔ تاریخ کی قیمت ادا کر کے ہی اس کے وجود کا حصول ہو سکتا ہے۔ تاریخ کے بغیر کوئی شاعری ممکن نہیں، مگر شاعری کا فرض، تاریخ کی قلب ماہیت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ تاریخ پہ زور دینے کا مطلب ہے کہ شاعر' وقت کو برہنہ کرتا ہوگا اور دکھاتا ہے کہ یہ کس کے لیے ہے۔"

حسن عباس رضا۔ وقت کو برہنہ کرکے دکھانے والے شعراء کے قبیل سے متعلق ہے۔ ۷۰ کی دہائی میں شعری سفر کا آغاز، اپنی بنیاد میں آمریت کے خلاف کھلی بغاوت کی جھلک کے ساتھ' ملک کے دو لخت ہونے کے آشوب کی شرمندگی کی ژولیدگی بھی لیے ہوئے ہے۔ ہماری نسلوں کے عذاب سرگونہ ہیں۔ اپنے بزرگوں کے سیہ کارناموں کے لیے بھی ہم ہی جوابدہ ہیں اور اپنے ہمعصروں کی ابن الوقتیوں کے گراف کی تشریح کی ذمہ داری بھی ہماری نسل کے سر ہے اور نئی نسل میں بے معنویت، بد دلی اور بے راہ روی کی تمام تر ذمہ داری بھی ہمارے ہی سر پہ ہے اور ہم کیا ہیں۔ شتر مرغ کی نسل۔

ادبی سطح پر دیکھا جائے تو ترقی پسندی سے آغاز کرنے والوں کے ہیئت اور مواد کے تجربے فیض کے علاوہ دیگر شعرا کی بلند آہنگی میں کھو جاتے ہیں اگر میراجی اور راشد نظم کے کینوس پہ اپنے نقوش ثبت نہ کرتے۔ ساٹھ کی دہائی میں کمٹ منٹ کے مسئلے پر شد و مد سے تحریر و تنقید کی جو لہر آئی اُس کو وسعت ۷۰ کی دہائی میں ملی۔ ویٹ نام، چین، لاطینی امریکہ، افریقہ اور فلسطینی ادب میں چیخ اور احتجاج کا وہی آہنگ اور عوام کی حاکمیت کا وہی نصب العین تھا، جس کی موج در موج بالید گی سیاسی اُفق پر بھی ہویدا تھی۔ حسن عباس رضا کی پرورش میں ترقی پسندی اور ساٹھ کی دہائی کی نظم کا پھیلاؤ شامل تھا، اس میں خوف سے رہائی کی وہ رمق بھی شامل تھی کہ جسے تنہا پسندی اور دیدہ دلیری کا نام بھی دیا گیا۔ ساتھ ساتھ روایت کا وہ عہد نامہ کہ جس میں اساطیری طرزِ معاشرت کی جھلکیاں بھی تھیں۔ یہاں حسن عباس رضا فیض اور فراز کے قبیلے کا شاعر ہے۔

قبیلہ کیا ہوتا ہے کیا احساس میں بھی قبائلی طرز حاوی آجاتا ہے۔ یہ ہے احساس اور الفاظ پہ بھی عصر کی گرفت کا اعلان۔ وہ لفظ جس سے انحراف کی کاوش اور جد و جہد میں ہم نئی لغت تیار کرتے ہیں۔ کوشش اور شعوری احساس کے باوجود، موجود کی تنگ نظری اور رجعت پسندی کی لہر ہمیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور یہ اس وقت کھلتا ہے جب تحلیلِ نفسی یہ وضاحت کرتی ہے کہ ابلاغ کس کا چاہیئے تھا اور کس کا ہو رہا ہے مگر یہ کیفیت تو میرے ساتھ گزری۔ حسن عباس رضا نے اس کیفیت سے گریز اس لیے کیا کہ وہ ہیئت میں لاشعوری خواہش کو زود رنجی کے حوالے کیے بنا، اپنی خواہش کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے شعر کہتا ہے۔ خواہش کی آزادی کا شعور ہی نئی شاعری کا بنیادی جزو ہے۔

نئی شاعری نئی زبان چاہتی ہے۔ محبت کے بغیر، جذبے کے بغیر یا احساس کے بغیر، زبان و بیان نہیں ہوتا، مگر محبتوں کے اظہار و بیان میں غالب اور کیٹس کے زمانوں سے لے کر آج تک بہت فرق پڑ گیا ہے۔ یہ فرق احساس کا ہے، اور احساس، زبان کے پتوار کا کام دیتا ہے۔ ایلیٹ نے "روائتی اور غیر روائتی" کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

"ندرت بہر حال دہرانے سے بہتر عمل ہے مگر کسی بھی فن کا نمائندہ الگ

سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کا مقام اور اس کی حیثیت تو اپنے
سے پہلے فنکاروں اور شاعروں کے حوالے سے شناخت کی جاتی ہے کہ ان سے
تضاد اور مماثلت اس کی فنا و بقا کے راستے متعین کرتے ہیں کہ فن کا مواد
کہیں یکساں نہیں ہوتا۔ مقصود یہ کہ شاعر کو ماضی کا شعور حاصل ہو اور وہ اس کو
حال کے علم سے بہتر کرنے کے مواقع اپنے فن کے حوالے سے پیدا کرے۔"

شاعر کو بہر حال جذبات و تاثرات کے امتزاج سے ناقابلِ اعتبار وجود تخلیق کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوتا ہے۔ حسن عباس رضا کا اس وجود کی تخلیق کی جہد میں یہ پہلا پڑاؤ ہے۔

حسن عباس رضا نے عمر کی زنبیل میں ہاتھ ہی ڈالا تو وقت کے سانپوں نے اُسے ڈسنا شروع کر دیا۔ شعر لکھنے پہ سزا، اور شعر چھاپنے پر سزا۔ مگر یہ دونوں تجربوں کے باوجود حسن عباس رضا کو خود پر پابندیاں عاید کرنا نہیں آئیں۔ مجھے تو یہ پاکستان کا آندرے مالرو لگتا ہے۔ مالرو فاشزم کے خلاف تھا۔ حسن عباس رضا محکومیت اور بے حسی کے خلاف ہے۔ حسن عباس رضا کی شاعری سن کر میرے جیسے بے حس وجود میں بھی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہی انفرادی حرارت کہیں اجتماعی حرارت بھی بن سکے۔

کشور ناہید

۳ر جنوری ۱۹۸۵ء

تیرہ

نئی حمد

اوّل

میرے خدا!
ایسے کون مجرم سوال تھے
جن کے جرم میں
ہم پہ تازیانوں کے سنسناتے
نشاں اُگاتے
جواب اُترے

ابھی تو ہم سے الم نصیبوں نے
شیرِ مادر کے ذائقوں کی گرہ نہ کھولی
کہ لب پہ کڑوی، کسیلی رُت کے
عذاب اُترے

ابھی تو صحنوں میں خواہشوں کی پنیریوں پر
امیدِ شبنم
نمو کے بوسے سجا رہی تھی

چودہ

ابھی تو ہم نے
زمیں سے اپنی جڑوں کی بابت سخن کیا تھا
ابھی تو پاؤں کے آبلوں میں
گئی مسافت کی تازگی تھی
ابھی سے ہم پر عذاب گھڑیاں
نہیں خدایا
نہیں خدایا

دوئم

۔۱۔

خدائے برتر

ابھی تو ہم نے
سرائے گیتی کے خواب کمروں میں
ہاتھ ملتی کنواریوں سے
گلاب رُت میں
وصال وعدوں کی بات کی ہے

ابھی تو ہم شاہزادیوں سے
ملاپ رُت کا وچن کریں گے

ابھی تو ہم
خواہشوں کی سیجوں پہ منتظر
رانیوں کی گجرا کلائیوں پر
ملن قصیدہ رقم کریں گے
ابھی سے ہم پر عذاب گھڑیاں !!
نہیں خدایا،
نہیں خدایا۔
یہ قہر ہوگا۔

سولہ

میں تلاش میں کسی اور کی، مجھے ڈھونڈتا کوئی اور ہے
میں سوال ہوں کسی اور کا، مرا مسئلہ کوئی اور ہے

کبھی چاند چہروں کی بھیڑ سے، جو نکل کے آیا، تو یہ کھُلا
وہ جو اصل تھا اُسے کھو دیا، جسے پا لیا کوئی اور ہے

کٹی عمر ایک اسی چاہ میں، اُسے دیکھتے کسی راہ میں
مگر اک زمانے کے بعد جو ہُوا آشنا، کوئی اور ہے

فقط ایک پل کے فراق میں، کئی خواب کرچیاں ہو گئے
جو پلٹ کے آئے تو یُوں لگا، یہاں سلسلہ کوئی اور ہے

وہی لوگ ہیں، وہی نام ہیں، وہی گھر وہی در و بام ہیں
مگر اب دریچوں کی اوٹ سے ہمیں جھانکتا کوئی اور ہے

کسی آنے والے سفر کی جب کرو ابتدا تو یہ سوچنا
میں اکیلا اس میں شریک ہوں، کہ مرے سوا کوئی اور ہے

اُسے مل کے آئے تو شام کو، مجھے آئینے نے کہا سنو
وہ جو صبحدم تھا حسن رضا، وہ تمہی ہو یا کوئی اور ہے

طلب ہوتی ہے کم، لیکن زیادہ مانگ لیتے ہیں
ہم ایسے تھُڑ دِلے کیوں غم کشادہ مانگ لیتے ہیں

جب اپنی پُر غمالی خواہشیں واپس نہیں ملتیں!
تو ڈھلتی عمر سے اک اور وعدہ مانگ لیتے ہیں

ہماری گفتگو رمز و کنایہ میں نہیں ہوتی
ہمیں جو مانگنا ہو، سیدھا سادا مانگ لیتے ہیں

ہم اپنا مدّعا دو چار لفظوں میں بیاں کر کے
مخاطب شخص سے اُس کا ارادہ مانگ لیتے ہیں

کھلی شطرنج پر جب بھی فرس آتا ہے نرغے میں

تو بزدل اپنے دشمن سے پیادہ مانگ لیتے ہیں

کبھی تو ہم بھرے ساغر الٹ دیتے ہیں وحشت میں

کبھی وحشت کے بدلے دُردِ بادہ مانگ لیتے ہیں

بہت دِن ہو گئے

بہت دِن ہو گئے
بادِ صبا نے کوئی سندیسہ نہیں بھیجا
نہ کوئی لہر
بہتے پانیوں سے لوٹ کر آئی
کہ نخلِ خشک کی مرتی جڑوں تک زندگی لاتی
بہت دِن ہو گئے ہیں۔

اور اِک ہم ہیں
کہ اپنی چھال کے اندر
ادھڑتی زندگی کا
لمحہ لمحہ گن رہے ہیں
مر رہے ہیں۔

بہت دن ہو گئے
بادل نے کرلاتی زمینوں کو
کوئی تحفہ نہیں بھیجا

اکیہ

بہت سی ایڑیاں زخما گئیں
لیکن کوئی چشمہ نہیں جاگا
کوئی سوتا نہیں پھوٹا
بہت دن ہو گئے ـــــ

بہت دن ہو گئے
کوفے سے کوئی خط نہیں آیا
نہ کوئی ایلچی
دارالامارہ میں گھرے
مختار ثقفی کی خبر لایا
بہت دن ہو گئے

بہت دن ہو گئے
افتادگانِ خاک نے
دلقِ اویس و چادرِ زہرہ کی بابت
کچھ نہیں پوچھا
نہ بوذر
شہرِ مسکن میں دوبارہ لوٹ کر آئے
نہ کوئی نامہ بر پہنچا
بہت دن ہو گئے ہیں ۔

بائیس

سو کچھ دن اور بھی ہو جائیں
تو کیا حرج ہو گا ——— !
ہم نہیں ہوں گے
مگر کوئی تو ہم جیسا
کسی آتے زمانے میں
یہ منظر اپنی آنکھوں میں اتارے گا
یہ سب پیغام
اپنے دستخط دے کر وصولے گا
یہ سب پیغام
سب منظر

مجھے ڈر ہے

محبت کے سہانے موسموں کی چاہ میں
ہر شب
میں سنہرے خواب بُنتا ہوں

سہانی صبح کی امید میں
ہر شام آنکھوں کی زمینوں میں
نئے سپنے اگاتا ہوں

گلابی خواہشیں مکھ پر کھلانے کے لیے
جاناں!
میں تیرے لمس
تیرے سانس کی خوشبو کا غازہ
ہاتھ کی سوئی لکیروں میں سجاتا ہوں

مگر جاناں
مجھے آتی رُتوں کی دہشتوں سے خوف آتا ہے۔

چوبیس

مجھے ڈر ہے
نہ جانے کس گلی، کس موڑ سے
اک تیر آ کر ئے
اور پیوستِ گلو ہو جائے
اک زنجیر پاؤں میں بجے
اور خواب سارے
کرچیاں ہو کر میری آنکھوں میں رہ جائیں
مقدر رات ہو جائے
مجھے ڈر ہے
مجھے ڈر ہے

پچیس

اُس شب کتنا ٹوٹ کے روئے، چاند، ہَوا، اور میں
تینوں ہی اک ساتھ اجڑے تھے، چاند، ہَوا، اور میں

چاروں اُور تھا سایہ کوئی، اور نہ در و دیوار
ایسے تپتے تھلوں میں اترے، چاند، ہوا، اور میں

لب بستہ تھے، حبس رُتیں تھیں، اور اماوس رات
کیونکر من کی بِپتا کہتے، چاند، ہوا، اور میں

سارے خواب عذاب ہوئے، اور سبھی خیال، زوال
کس بِرتے پھر سپنے بُنتے، چاند، ہوا، اور میں

چھبیس

کیا منظر تھے، آنکھوں میں جو ناخن گاڑ گئے
کون ستم رُت تھی جب بچھڑے، چاند، ہوا، اور میں

چاند، ہوا، اور مجھ میں سجناں، کوئی فرق نہیں
ایک سی رُت کے چاہنے والے، چاند، ہوا، اور میں

حسنؔ رضا، وہ رات مُرادوں والی جب بھی آئی
دیکھنا کیسے گلے ملیں گے، چاند، ہوا، اور میں

ستائیس

شہپر کٹ جانے پر بھی ہم، اُڑنے کو بیتاب بہت ہیں
کال ہے جاگتی تعبیروں کا، ورنہ اپنے خواب بہت ہیں

فتحِ مبیں کی راہ میں حائل خندق، بس اک جست ہے، لیکن
مسئلہ شاہ سواروں کا ہے، یوں تو پا بہ رکاب بہت ہیں

ہم نے بھی اُس کشتِ ستم میں، خواہش بیج اُگائے جہاں پر
سجل رُتوں کے گل عنقا ہیں، درد کے کالے گلاب بہت ہیں

شب کی سیہ سفاک رِدا آنکھوں سے جب اتری تب یہ کھلا ہے
شبخوں مارنے والے گروہ میں، دشمن کم، احباب بہت ہیں

اٹھائیس

خودکُشیوں کی رُت میں جاں سے گذرنا سہل ترین عمل ہے

لیکن سجی سجائی سُولی چوُمنے کے آداب بُہت ہیں

حسنؔ رضا ہم اُس بدقسمت شہر کنارے پر رہتے ہیں

جس کے ورے گزرتے دریا کی تہ میں سیلاب بہُت ہیں

خواہشیں بھی دردِ محرومی میں ضم ہو جائیں گی
کیا خبر تھی آرزوئیں کالعدم ہو جائیں گی

گھر کی ہر دیوار اِک دیوارِ گریہ ہو گئی
اَب تو آنکھیں عادتاً ہر شام نم ہو جائیں گی

دھجیاں اپنے گریبانوں کی رکھیں سینت کر
آنے والے موسمِ گُل میں عَلَم ہو جائیں گی

جان تیرے قرب سے کچھ خواب اَمر ہو جائیں گے
اور کچھ محرُومیاں بھی کم سے کم ہو جائیں گی

تیس

کچھ برس پہلے کہا تھا اِک نجومی نے مجھے
تیرے ہاتھوں کی لکیریں محترم ہو جائیں گی

نااُمیدی کفر ہے لیکن یہ لگتا ہے حسنؔ
میری باقیماندہ خوشیاں، میرا غم ہو جائیں گی

لکشمی، لکشمی

خواہشیں ہیں کہ ہم بھی کسی روز
آسودگی کی ردا اوڑھ کر گھر سے نکلیں
بہاروں میں کھِلتے گلابوں کو
اپنا مقدّر کریں
لکشمی لکشمی
میرے آنگن اُتر

جو دعائیں بھی ازبر تھیں
سب مانگ لیں
جو عقیدے تھے
سب نذرگزُران کر
تیرے دوارے تک آئے
ہمارے تہی دامنوں کو
محبت کی خیرات دے
سُرخ پازیب پہنے ہُوئے
رقص کر

بتیس

لکشمی لکشمی
میرے آنگن اُترو

ہم نے چاہت کے جتنے بھی سپنے بُنے تھے
وہ آنکھوں کے روزن سے نکلے نہیں
جو تمنا کی شیشہ گری کی
وہ سب کرچی کرچی ہوئی
ریزہ ریزہ ہوئی
ان بکھرتی ہوئی کرچیوں کو بس اک بار آئینہ کر
لکشمی لکشمی
میرے آنگن اُتر

اس سے پہلے کہ بیچارگی کی ہوا
ہم سے گنتی کی ہر سانس بھی لے اُڑے
ہم کو ویران کرے
لکشمی لکشمی
اک کرم
اک نظر
مجھ کو آسودہ کر
میرے آنگن اُتر
لکشمی لکشمی

•

نئے سال میں شہزادی سے مکالمہ

سنو شاہزادی!
نئے سال کی مسکراتی ہوا
جب تمہارا طوافِ بدن کر کے لوٹے
تو اُس کو مرے گھر کا رستہ بتانا
میں اپنے گھر آنگن میں
خواہش کے گجروں
تمنّا کے چمکیلے کنٹھوں سے اُس کا
سواگت کروں گا۔

سنو شاہ زادی!
نئے سال چھاجوں برستی ہوئی بارشیں جب بھی برسیں
تو دالان میں بھیگتی تیتریں
خوشبوئیں بانٹتے
سرخ پھولوں پہ دستِ حنائی کا اک سائباں تان دینا
کہ باہم تمنّاؤں کے اِن گلابوں کو
بارش کی ظالم نظر لگ نہ جائے۔

مگر شاہزادی!
نئے سال بھی
گر وہی دُوریاں، اور مجبُوریاں
اپنی تقدیر ٹھہریں
تو پھر تُو بتا
اور کتنے برس
ان سجل خواہشوں کے سجیلے گلابوں کو
کِھلتے ہوئے دیکھنے کی دعا
اپنے رب سے کروں گا
بتا شاہزادی! ؟

آوارگی میں حد سے گذر جانا چاہیئے
لیکن کبھی کبھار تو گھر جانا چاہیئے

اُس بُت سے عشق کیجیئے، لیکن کچھ اِس طرح
پُوچھے کوئی تو صاف مُکر جانا چاہیئے

مجھ سے بچھڑ کے ان دنوں کِس رنگ میں ہے وہ
یہ دیکھنے رقیب کے گھر جانا چاہیئے

جس شام شاہزادی فقیروں کے گھر میں آئے
اُس شام وقت کو بھی ٹھہر جانا چاہیئے

ربِ وصال، وصل کا موسم بھی آ چکا
اب تو میرا نصیب سنور جانا چاہیئے

سیلابِ غم کی نذر سبھی خواہشیں ہوئیں
اَب درد کا یہ دَریا اُتر جانا چاہیئے

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا، تو پھر ساحلوں پہ کیوں
اس کے لیے تو بیچ بھنور جانا چاہیئے

جن ساعتوں میں بے ہنری ہو عیارِ عقل
اُن ساعتوں کا سوچ کے ڈر جانا چاہیئے

شہرت سمیٹ لی ہے بہت کیٹس کی طرح
اب ہم کو بھی جوانی میں مر جانا چاہیئے

بیٹھے رہو گے دشت میں کب تک حسنؔ رضا
پاؤں میں جاگ اٹھا ہے سفر، جانا چاہیئے

سینتیس

فرشِ بلور پر ناچتے ناچتے، بازوؤں میں سمٹتی گئیں لڑکیاں، رقص ہوتا رہا
صندلیں شام کے سائے بڑھتے گئے، جل اٹھیں خواہشیں، گُل ہوئی بتیاں، رقص ہوتا رہا

بوالہوس موسموں کے دریچے کھُلے، بام و در پر سجائی گئی یاسمن، صید کرنا جو تھا
رفتہ رفتہ ہوئیں بند سب کھڑکیاں، بج اٹھیں جھانجھنیں، رو پڑیں تتلیاں، رقص ہوتا رہا

خواہشوں پر لگائی گئیں قدغنیں، آرزوئیں بھی زنجیر کر دی گئیں، راہیں مسدود تھیں
پھر بھی اہلِ جنوں تھے کہ بڑھتے گئے، گرچہ کم ظرف اٹھاتے رہے انگلیاں، رقص ہوتا رہا

تشنہ کامی کے بے انت صحراؤں میں، پنکھڑی پنکھڑی خواہشیں رُل گئیں، ریت کے مُل بکیں
زندگی تیری بے فیض درگاہ سے، اپنی جھولی پڑیں صرف محرومیاں، رقص ہوتا رہا

مہوشوں کی رفاقت کے باوصف، کشکولِ لب میں نہ کوئی بھی بوسہ گرا، اور اِسی آس میں
کھِل اٹھے رت جگے، آنکھ کی سبز شاخوں سے گرنے لگیں، نیند کی پتیاں، رقص ہوتا رہا

دے ہاتھ میں سوہنا ہاتھ، کہ سجری سیج سجے
پھر چھیڑ ملن کی بات، کہ سجری سیج سجے

میرے داتا، ہجر کی گھڑیاں ہم پر قہر ہوئیں
اب مہر کی ہو برسات، کہ سجری سیج سجے

مجھے یاد ہے اُس نے آخری خط میں یہ پوچھا تھا
کب آئے گی وصل کی رات، کہ سجری سیج سجے

میرا کاسۂ لب برسوں سے خالی ہے، اس میں
کچھ صدقہ، کچھ خیرات، کہ سجری سیج سجے

اک خواہش نیم کھلے دروازے میں جاگی
کوئی دم تو رُکے بارات، کہ سجری سیج سجے

شہزادی مانگ دُعا، اُس رنگلے موسم کی
ہم جس میں کھلیں اک ساتھ، کہ سجری سیج سجے

وہ عام سی ایک شام تھی جب جُدا ہُوئے ہم
نہ ٹوٹ کر پیار ہی کیا، اور نہ رو سکے ہم

جو رنجشیں، جو گلے تھے، ہونٹوں پہ رہ گئے سب
بس ایک دُوجے کی چشمِ نم دیکھتے رہے ہم

وہ دن بھی کیا تھے، کہ سارے لمحے گلاب سے تھے
یہ دن بھی کیا ہیں کہ خوشبوؤں کو ترس گئے ہم

فراقِ جاناں کسی قیامت سے کم نہیں تھا
پر اے غمِ یار اب تو پتھر کے ہو چُکے ہم

حسن رضا، کن رتوں سے مانگیں وصال گھڑیاں
کہ اب نہ وہ ہے، نہ چاند راتیں، نہ پہلے سے ہم

بحرین کی ایک شام میں مکالمہ

دامنِ کوہ میں
آبشاروں کا شور اس قدر تھا
کہ اُس رات
کانوں پڑی کوئی آواز
کوئی صدا
اپنا مفہوم کہتی نہ تھی
پھر بھی
چاہت کے نشّے میں ڈوبے ہُوئے
کسمساتے بدن
تیز سانسوں کے چپ استعاروں میں گمُ
گفتگو کر رہے تھے۔

---

۹ اپریل [illegible]ء

میاندم میں ایک دُعا

اے خدا
سارے شہروں کے
سارے مکانوں کے
سارے مکینوں کے دل
اتنے سرسبز و شاداب کر
اُن کو اتنا سکوں دے
کہ جتنا سکوں
برف پہنے ہُوئے خوب صُورت پہاڑوں کے
دامن میں
جھرنوں کی وادی
میاندم کے دامن میں تھا

---

۱۰ اپریل ۸۴ء

وادیٔ سوات کا خوبصورت مقام

تین شعر

چڑھتی عمروں کے فسانے کھڑکیوں میں رہ گئے
جتنے بھی خط ہم نے لکھے، کاپیوں میں رہ گئے

شہرِ ناقدراں کا تحفہ بھی نہ یکجا رکھ سکے
زخم گھر تک لائے، پتھر راستوں میں رہ گئے

ہم تو خود اک سانولے منظر کے قیدی ہو گئے
اور ہمارے تذکرے رنگیں رُتوں میں رہ گئے

چوالیس

دِل خزانے میں اِک ڈوبتی زندگی کے سوا کچھ نہیں
عمر بھر دُکھ پہ تقسیم ہوتے رہے اور بچا کچھ نہیں

اپنی آئندہ نسلوں کو دُکھ کے سوا اور کیا بانٹتے
جن کو ورثے میں محرومیوں کے علاوہ ملا کچھ نہیں

آرزوؤں کے اندھے تعاقب میں سانسیں اُکھڑتی گئیں
اپنی دہلیز تک آتے آتے نظر میں رہا کچھ نہیں

مدتوں زلزلے ذات کے بند کمروں میں اُٹھتے رہے
لیکن اپنی انا کے علاوہ مکاں میں گرا کچھ نہیں

اتنی بے گانہ رُت تھی کہ جب آخری شام رخصت ہوئے

کوئی ملنے نہ آیا، کسی آنکھ نے بھی کہا کچھ نہیں

کب تلک دستکوں کی تمنّاؤں میں رتجگے جان جی

موت کی گود میں سو رہو، زندگی میں دھرا کچھ نہیں

چھیالیس

اپنی سوچ سے آپ ہی گھائل ہو جائیں گے
یوں لگتا ہے عشق میں پاگل ہو جائیں گے

جب کبھی وحشت اوڑھ کے گھر سے ہم نکلیں گے
شہر ہمارے ہجر میں جنگل ہو جائیں گے

جتنا وقت میسّر ہے، ہمیں آنکھ میں رکھو
ہم تو رواں منظر ہیں، اوجھل ہو جائیں گے

اُس شب چاند صبا کی رتھ پہ سوار آئے گا
جس شب اپنے خواب مکمّل ہو جائیں گے

اپنی سیہ بختی کا یہی اِک فائدہ ہو گا
کم از کم اُس کی آنکھ کا کاجل ہو جائیں گے

جس دن اپنی یاد میں ہم دل کھول کے روئے
دیکھنا سارے منظر جل تھل ہو جائیں گے

حسنؔ رضا، یہ وحشت یہ دیوانگی چھوڑو
وَرنہ کچھ لوگ اور بھی بیکل ہو جائیں گے

وقت سے پہلے مر جانے کی خواہش میں
ریت بدن لے آئے تھے ہم بارش میں

یوں لگتا ہے اک دِن دَھر لیے جائیں گے
زندگیاں کرنے کی گھناؤنی سازش میں

کبھی تمنّا تتلی ہاتھ نہیں آئی
پھول سی عمر فگار ہوئی اس کوشش میں

شہزادی سے وصل بھلا کب ممکن ہے
لیکن ہرج بھی کوئی نہیں اِس خواہش میں

جتنی دعائیں ازبر تھیں، سب بھول گئے
جب سے لیکھ ستارہ آیا گردش میں

حسن رضا، اس غم ڈھلوان پہ ڈولتا جسم
ٹوٹ بکھر سکتا ہے ذرا سی لغزش میں

شہزادے کے لئے

پردیس میں مارے گئے جواں سال بھائی ارشد محمود کے نام

۔۔۔۔۔اُس نے کہا تھا
جب میں واپس لَوٹ کے آؤں
گھر آنگن میں
رنگ برنگے پھُول کِھلے ہوں
دیواروں پر خواہش رنگ دھنک پھیلی ہو
کیاری کیاری ہری بھری ہو
گلی گلی مُسکان سجی ہو
اُس نے کہا تھا

اس نے کہا تھا
جب میں واپس گھر آؤں، تو
میرے وِیر، مری ماں جائی
میری ماں، اور
میرے ابّو کے چہروں پر
سجل تمنّا کی تکمیل کے گل مہکے ہوں
بند لبوں پہ میرے لَوٹ آنے کے نغمے

چمک رہے ہوں
اس نے کہا تھا

رخصت ہوتے لمحوں
اک روتے ہنستے چہرے کو اُس نے
پہنے اور نہ پہننے کے باوصف کہا تھا
تم ارمان سجا کر رکھنا
میں ویروں اور دوستوں کے جھرمٹ میں آکر
چاند سفر کو جانے والی
سہرا رتھ پر
تمہیں سجا کر گھر لاؤں گا
روشنیوں کے ست لڑیئے ہاروں کا میں
شہ سیپ بنوں گا
اس نے کہا تھا (شاید اُس نے یہی کہا تھا)

..... اور پھر اک دن
جلتی دوپہروں میں وہ شہزادہ آیا
وہ شہزادہ،
جو بالکل شہزادوں سا تھا
وہ شہزادہ،
جو کہ تلاشِ رزق میں دور سفر پہ گیا تھا

وہ شہزادہ،

جو اپنے ویر دی، اپنی ماں جائی

اپنے ابو، اور امی کی خوشیوں کا مرکز تھا

وہ شہزادہ، گنگ لبوں پہ

چپ کی مہر سجائے گھر آنگن میں اترا

اس کو گود کھلانے

اس کو سہرا سجانے والے ہاتھوں میں لرزہ تھا

رہ تکتی آنکھوں میں ہچکیاں، اور آہیں تھیں

جس آنگن میں شہنائیوں کے گل کھلنے تھے

اس آنگن میں

سسکیوں، آہوں اور چیخوں کا حشر بپا تھا

ان چیخوں اور سسکیوں میں

بارات اٹھی اس شہزادے کی

جس نے ہنستے لبوں، رنگیلے موسم میں

گھر لوٹ آنے کا پیمان کیا تھا.......

لیکن لوٹ کے گھر نہیں آیا

اس کا کورا جسم تو آیا

ہنستا چہرہ گھر نہیں آیا۔ گھر نہیں آیا۔

ترپن

دُور سفر پہ گئے مسافر کا سندیسہ گھر نہیں آیا
جسم تو آیا، لیکن اُس کا ہنستا چہرہ گھر نہیں آیا

کتنی جلتی بجھتی آنکھیں اُس کی راہ میں بچھی ہُوئی تھیں
مگر تلاشِ رزق میں گیا ہُوا شہزادہ گھر نہیں آیا

ابھی تو ماں جائی نے اپنے وِیر کو سہرا باندھنا تھا، پَر
اپنی ماں سے روٹھ کے جانے والا بیٹا گھر نہیں آیا

ایک برات، اور ایک سوالی چہرہ، بیچ جنازہ گاہیں
کیسے کیسے جتن کیے تھے، پھر بھی دولہا گھر نہیں آیا

روتے گھروں کی دیواروں پر آویزاں اُس کی تصویریں
سِسک سِسک کر پوچھ رہی ہیں سب کا لاڈلا گھر نہیں آیا

حسنؔ رضا، اُس دِن تو بچھڑنے والے بھی کتنے یاد آئے تھے
جس دِن لوٹ کے آنے والا، راج دلارا گھر نہیں آیا

چلتے پھرتے ہوئے لوگ کم ہو گئے، صرف کتبوں پہ نام و نشاں رہ گیا
ایک چہرہ جو آنکھوں کی بینائی تھا، کس سے پوچھیں گے اب وہ کہاں رہ گیا

اُس کے آنے پہ گھر کے سبھی بام و در جگمگاتے تھے روشن دنوں کی طرح
وہ جو رخصت ہوا تو ہر اک خشت پر، ایک غم، ایک نقشِ فغاں رہ گیا

پانیوں کے سفر پر گیا چاند جب، اپنے آنگن میں اترا تو ہم پر کھلا
ایک ہالہ یہاں تک تو پہنچا مگر، اک اجالا کہیں درمیاں رہ گیا

اُس کے ہاتھوں لگائے ہوئے سب سمن اب تو دیوار سے سر اٹھانے لگے
اور شاخوں پہ کھلتے ہر اک پھول میں اس کی موجودگی کا گماں رہ گیا

اپنی آنکھوں کو دہلیز پر چھوڑ کر، سب مکیں مشترک غم لیے سو گئے
منتظر کھڑکیوں کو سمیٹے ہوئے، بین کرتا، سسکتا مکاں رہ گیا

بشارت اَب سو اینز تے تک آپہنچی

میں جس دن تیسویں دیوار تک پہنچا
تو یادوں کی طرح
پیچھے گزرجاتی ہر اِک دیوار نے
مجھ کو صدا دی تھی

میں آج اکتیسویں دیوار پر ہوں
اور اب بھی
میرے کشکولِ سماعت میں صداؤں کے وہ سکّے گر رہے ہیں
جو کسی بازار یا دکان پر چلتے نہیں ہیں۔
اور بہت پیچھے کو رہ جاتی
کسی دیوار سے اب بھی صدا آتی ہے
آجاؤ حسن عباس آجاؤ — !
کہ گلیوں اور بازاروں میں
کنچے کھیلتی عمریں
تمہیں آواز دیتی ہیں ——

تو میں اِک جست میں اُن موسموں کو
اُن دنوں کو لوٹ جاتا ہوں
جہاں مجھ سے میرا چنچل بھیلا بچپنا
ایسے لپٹ جاتا ہے
جیسے مدّتوں کے بعد دو بچھڑے ہوئے محبوب ملتے ہیں
——— میں اُس سے پوچھتا ہوں
خواب ہوتی ساعتوں کی کس گلی میں
میری خوشیوں کا خزینہ دفن ہے۔ ؟"

تو، وہ
میری انگلی پکڑ کر
مجھ کو اک ایسی گلی کے موڑ پر لے کر پہنچتا ہے
جہاں سے دُور تک دکھلائی دیتی ساری گلیاں
ایک دُوجی سے کچھڑی اس طرح لپٹی ہیں
کہ جیسے دو بدن پیوست لیٹے ہوں

میں ان گلیوں میں آوازہ لگاتا ہوں
"کہ کوئی ہے۔ ؟
اگر کوئی موجود ہے تو باہر آجائے۔
کہ ناموجود لمحوں سے گلے ملنے
حسن عباس آیا ہے"

"تمہارا دوست آیا ہے"

ابھی میری صدا
گلیوں کے اُجڑے بام و دَر کو چوم کر واپس نہیں آتی
کہ ہر گھر کے شکستہ دَر سے
اُجلے، مسکراتے، پھول چہرے
مجھ سے ملنے کے لیے
گرتے سنبھلتے، دوڑتے آتے ہیں
میں سب سے گلے ملتا ہُوں
اُن کو چُوم لیتا ہوں
وہ مجھ سے
اور میں اُن سے بیت جانے والے ماہ و سال کا
احوال کہتا ہُوں
میں جب اُن کو بتاتا ہُوں
کہ میں شاعر ہوں
اور حرف و سخن کی بادیہ گردی مری تقدیر ٹھہری ہے
تو وہ ہنستے ہیں
اتنی زور سے ہنستے ہیں۔
جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں
اک ساتھ بج اُٹھّیں ——!

وہ کہتے ہیں
کہ تم سا لااُبالی اور کھلنڈرا شخص
کیونکر شعر کہتا ہے
کہ اب تو شعر کہنا
اک عذابِ مستقل ہے!
تم نے کیونکر اس عذابِ جاں گُسل کو
اپنے سینے سے لگایا ہے؟

تو میں اُن سب کی صورت دیکھتا رہتا ہوں
اُن سے کچھ نہیں کہتا
نہیں کہتا
کہ لمبی چُپ کی وا آغوش
مجھ کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے
اور میں چُپ کی بند آغوش میں سمٹا ہُوا
خاموش رہتا ہوں
میں اُن سے کچھ نہیں کہتا
اور اُن کا ہاتھ تھامے
خواب ہوتے باغ کی اُس سمت لے چلتا ہوں
جس کی ہر روش پر
میری گذری ساعتوں کے نقش کندہ ہیں۔
حسیں یادوں کے سجرے باغ میں ہر سُو

گلاب و نرگس و نسرین کے پھولوں پہ بیٹھی تتلیاں

آہٹ ابھرتے ہی

ہوا کے دوش پہ اُڑتی، مچلتی، لہر یئے لیتی

——— ہمارے جال ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں

اور ہم مٹھیوں پر پھیل جاتے رنگ

آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

اُن کو چُومتے ہیں ———

——— آنکھ بادل سے برستی بارشیں

میری ہتھیلی پر کھلے تتلی کے رنگوں سے گلے ملتی ہیں،

اس باہم رفاقت سے

ہتھیلی پر مرے بچپن،

مرے ہمزاد کی تصویر ابھرتی ہے۔

میں اُس کو دیکھ کر روتا، سسکتا ہوں۔

——— اسی اثنا میں میرے یار سارے

تتلیوں کو قید کرنے کی مسلسل کوششوں سے تنگ آکر

میری جانب لوٹ آتے ہیں،

مجھے روتا، سسکتا دیکھ کر ہنستے ہیں

اتنی زور سے ہنستے ہیں

جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں

اک ساتھ بج اُٹھیں

وہ مجھ کو قہقہوں کے درمیاں

میداں کی جانب لے کے چلتے ہیں
جہاں سب بھول ہاتھوں میں
پتنگیں اور رنگلی چرخیاں ہیں —
اور میں اُن میں گھرا
رنگیں پتنگوں کو
کھُلی روشن فضا میں پینچ لڑتے، اور کٹتے دیکھتا ہوں —
——— میرے ہاتھوں میں بھی اب
مانجھا لگی اِک ڈور کی چرخی ہے
اور میری پتنگ اڑتی،
ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی دوجی پتنگوں سے
گلے ملتی،
فلک کی وسعتوں میں تیرتی ہے۔
دفعتاً اِک پینچ لڑتا ہے ———
مری مانجھا لگی ڈور اب مرے ہاتھوں پہ
اتنی تیز رفتارانہ چلتی ہے
کہ جیسے ماؤں کی آغوش سے نکلے ہوئے بچے
بڑھاپے کے سمندر تک پہنچ جاتے ہیں —
——— اور پھر دفعتاً انگشت میں یوں ڈور کھبتی ہے
کہ جیسے اپنا خنجر
اپنے سینے میں اُتر جائے —
مرے پنڈے میں سِسکاری ابھرتی ہے —

باسط

میں بے بسی لیے چاروں سمت تکتا ہوں
وہاں کوئی نہیں ہے !!
اب نہ ہاتھوں میں پتنگیں ہیں
نہ پیاروں،
اور یاروں کے ننھا سا پھول سے چہرے۔
—— میں اب تنہا کھڑا
خود کو جوانی سے گلے ملتا ہُوا محسوس کرتا ہوں،
مگر میں پھر بھی تنہا ہوں۔
بہت تنہا !!

اچانک خواب ہوتے پردۂ سیمیں پہ خواہش رنگ
تصویریں اُبھرتی ہیں
—— کسی کو چاہنے،
اور چاہے جانے کی تمنّا۔
میرے دل آنگن میں
کلیوں اور غنچوں کی طرح
انگڑائی لیتی ہے، چٹکتی ہے۔

مری خوش قسمتی
میری ازل تنہائی کو یوں ڈھانپ دیتی ہے
اور نہ جیسے ماں کی ممتا

ترییٹھ

لاڈلے بچّوں کے سب عیبوں پہ پردہ ڈال دیتی ہو
مجھے شہرِ جفا میں
چاہنے، اور چاہے جانے کی تمنّا ہی نہیں رہتی
کہ مجھ سے اتنی بے پایاں محبّت
اور چاہت آن ملتی ہے
کہ پھر کوئی تمنّا، کوئی خواہش ہی نہیں کھلتی ——

گلابی عمر کی روشن جبیں شہزادیوں،
کومل سجیلی لڑکیوں کی ہاتھ رکھیاؤں پہ
میرا نام روشن چاند کی صورت دمکتا ہے
دھنک کے رنگ میں ڈوبے ہوئے پیراہنوں کا شامیانہ
میری پیاسی آنکھ کے صحرا میں کھُلتا ہے
تمنّا، دودھیا جسموں کی صورت
میرے آنگن میں اترتی ہے،
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ گویا میں مقدّر کا سکندر ہوں
کہ جس دم بھی جسے چاہوں
اُسے زیرِ نگیں کر لُوں ——

—— مگر ——
حیران کن خوشیوں کے ہوتے بھی

چونسٹھ

مری تنہائی مجھ پر غالب آتی ہے
مری بے چینیاں
میرا تجسس
ساحلِ اُمید کی جانب نگاہیں وا کیے
بیت کی طرح استادہ رہتے ہیں

میں سنتا ہوں
کہ رس ٹپکاتی شہد آگیں صداؤں کی جگہ
اب شہر کی گلیوں میں
بازاروں، محلّوں میں
برستے تازیانوں کی کرخت، اور خوف پھیلاتی صدا کی
حکمرانی ہے —

سجل جسموں سے اب خوشبو نہیں اُگتی
کہ وحشت بال کھولے
کوچہ و بازار میں
دہشت ملی بارود کی بدبو اگلتی ہے

مرے یاروں
مرے پیاروں کے نامے
شہرِ مسکن سے نہیں

زنداں سے آتے ہیں
کہ سارے قاصدوں نے
بیعتِ جبر و ستم کر لی ——

مری بے چینیوں
میرے تجسّس کا سمندر
لمحہ لمحہ ایسے طوفانوں کی زد پر ہے
جو آنے والی ساعت کی سبھی طغیانیوں کے بعد
کالی رات کا
کالا مقدّر ہیں ——!

مرا بچپن
جوانی کی سجل انگشتری میں وہ نگینہ ہے
وہ آئینہ ہے
جس میں اچھے موسم،
چاند جیسے اجلے منظر دیکھ لیتا ہوں، ——
—— وگرنہ ——
ہاتھ کی ریکھاؤں میں
میرے مقدّر کا سکندر
فاتحینِ وقت کے اُس فیصلے کا منتظر ہے
جس کے بعد

آواز کا روشن، جگر سُورج
سیہ شب کی اندھیری گود میں گر جائے گا !!
لیکن
سیہ شب مختصر ہے ـــ
اُس کی کالی کوکھ سے
میری تمنّاؤں کا
وہ سُورج بھی ابھرے گا
جو میری
اور تمہاری آرزوؤں کے گلابوں کو
سجل رنگینیاں دے گا ـــ
وہ سورج تو بہت نزدیک ہے
اُس کی بشارت
اب سوا نیزے سے بھی نزدیک تر ہے،
اور بھی نزدیک تر،
نزدیک تر ـــــــــــ

غلام گردش میں ایستادہ غلام۔ ارادے بدل چکے ہیں
شہِ زماں اب قیام کیسا، کہ کوچ کے طبل بج رہے ہیں

فصیل اندر سپاہِ پیشہ وراں بھی مفلوج ہو چکی ہے
فصیل باہر ہجومِ عشّاق نے بھی پیکاں چڑھا لیے ہیں

حرم سراؤں میں پلنے والی کنیز بھی اب یہ جانتی ہے!
کہ انہدامِ فصیلِ قصرِ شہی میں بس چند ثانیے ہیں

نہ اسپِ تازی کے شہسواروں، نہ فیل بانوں کا زعم کرنا
کہ اب کے بادِ سموم و صرصر نے قصر کی سمت رُخ کیے ہیں

اڑسٹھ

بس اب کماں داروں کا نشانہ، وہ آخری بُرج ہے کہ جس پر
اُڑی اُڑی رنگتیں، اکھڑتے قدم نمک خوار رہ گئے ہیں

رجز کے آہنگ میں نوائے قصیدہ گوئی سِسک رہی ہے
دفیں سجاتے گلاب ہاتھوں میں اب چمکتے تبر کھُلے ہیں

دشمن کو زد پر آجانے دو، دشنہ مِل جائے گا
زندانوں کو توڑ نکلنے کا رستہ مل جائے گا

شاہ سوار کے کٹ جانے کا دُکھ تو ہمیں بھی ہے لیکن
تم پرچم تھامے رکھنا، سالارِ سپہ مِل جائے گا

ہمیں خبر تھی شہر پنہ پر کھڑی سپاہ منافق ہے
ہمیں یقیں تھا، نقب زنوں سے یہ دستہ مل جائے گا

سوچ کمان سلامت رکھنی ہوگی، تیر انداز بہت
کون ہدف ہے اور کہاں ہے، اس کا پتہ مِل جائے گا

ستّر

بس تم جبر کی چوٹی سر کرنے کا عہد جواں رکھنا
اُس تک جانے والے رستوں کا نقشہ مِل جائے گا

محسن رضا، اُٹھ اور قدم آوازِ جرس پر رکھ، ورنہ
شاہ کا سر لانے تجھ سا کوئی دیوانہ مل جائے گا

اکھ ستو

لیلےٰ، اب کس دشت میں تیرے مجنوں خاک اُڑائیں
اُجڑی محمل دیکھ کے چپ سادھیں، یا حشر اُٹھائیں

ناقۂ خواہش ہوا ہوئی، اور آنکھ میں ریت سمائی
کون سوار زقند بھرے، اب راسیں کس ہاتھ آئیں

اڑیل اسپ سیہ (ہم آبلہ پا، اور خارِ مغیلاں)
کس ڈھب اس کو رام کریں، اسے کیا وعدہ پہنائیں

قصہ گوؤں سے کون کہے، کہ وہ خلوتِ شاہ میں جا کر
قصۂ صبرِ ستم زدگاں کا آخری باب سنائیں

بہتر

خسروِ دوراں، ہم سے سہل طلب فرہاد بھی شاید

خاطرِ شیریں، اک دن تیرے لہو کی نہر بہائیں

ربِّ جمال، اتار زمیں پر حُسن چراغ، کہ اب تو

جادۂ عشق اجاڑ رہی ہیں، وحشی، کور بلائیں

اینٹی ھائیکو

۱

بزدلی ہے بہت عزیز ہمیں
صبح و شام اِس سے پیار کرتے ہیں
کون جائے جنازہ گاہوں میں

۲

سنگ شماری کے بعد اب ہم کو
کن صفوں میں شمار ہونا ہے
جین ڈکسن سے پوچھ لیتے ہیں

۳

شاخ شاخ آئینوں کے پہرے ہیں
گھونسلوں سے پرند کیسے اڑیں
اِن کو بھی اذنِ سنگ باری دے

۴

اب تو کھلی شہراہوں پر بھی
آہنی پودے اُگ آئے ہیں!
اب کیا حکم ہے میرے آقا؟

۵

حرمتِ حرف تھی جن سے قائم
اب وہی شاہ سے پوچھ رہے ہیں!
کتنے شعر قصیدے میں ہوں؟

۶

آسماں پہ چیلوں نے
دائرے بنائے ہیں
آؤ زخم گنتے ہیں

۷

پھول بیچنے والے
انتظار کرتے ہیں
تازہ تازیانوں کا

۸

شہر کے گلی کوچے
چاپ چاپ ادھڑتے ہیں
پھر بھی خط نہیں آتا

کلر بلائنڈز کے نام

نظر بھر کر
اگر یہ چنبیلیوں،
تازہ گلابوں،
کاسنی اور چمپئی پھولوں کے
روشن حسن کو دیکھو
تو تم جانو
خدائے لم یزل کی کیسی کیسی نعمتیں
کتنے خزینے
سینۂ گیتی پہ رقصاں ہیں

کبھی اے ساونوں کے کور چشمو!
روشنی چکھّو
شبِ یلدا کے گُم گشتہ مکاں کے
شپّرک زادو!
چمکتی ساعتیں پہنو
گلابوں کی مہک اوڑھو
حصارِ رنگ سے نکلو۔

تیسری آنکھ

...... تو پھر یوں ہُوا

ہم شکستہ دلوں نے سِپر ڈال دی

جتنے ناوک بدست اپنے احباب

کوہِ وفا پر کھڑے تھے

ہمیں اُن سبھی کی جگرداریوں

بے غرض جرأتوں پر مکمل یقیں تھا۔

مگر جاں نثاری کے اُس معرکے میں

صفِ ہمرہاں کو پلٹ کر جو دیکھا

تو کوئی نہیں تھا ——

سبھی نرغۂ دشمناں میں کھڑے تھے

ہجومِ کشیدہ سراں

پابہ زنجیر، زیرِ نگیں تھا ——

—— سو پھر یوں ہُوا

مقتلوں کی طرف جب روانہ ہُوئے ہم

تو ساری جبینوں پہ ننگی خجالت

برہنہ ندامت کے قطرے جڑے تھے
ہم اندھے سرابوں کے لامنتہا سلسلوں میں کھڑے تھے
عذر ساعتوں
تھر تھراتے لبوں پر
فقط خامشی تھی
ستم تازیانوں کے قاتل پھریرے
فصیلِ زبان و دہن پر گڑے تھے
وہ موسم کڑے تھے

—— تو پھر یوں ہُوا
ہم دریدہ بدن
دشنۂ قاتلاں کا ہدف بن گئے
قطرہ قطرہ ہمارا چمکتا لہو
شہرِ نامہرباں کے در و بام پر
جگمگانے لگے
تیسری آنکھ کا نامہ بر ھم کو مژدہ سنانے لگا۔

پت جھڑ کے بعد ایک دُعا

.... تو آؤ ہاتھ اُٹھائیں
اُن زمانوں کے لیے
جو آسمانوں سے ابھی اترے نہیں

ایسی دعائیں، جو
ہواؤں میں معلق ہیں
اُنھیں بابِ رسائی تک اتار آئیں
کہ شاید کوئی دستِ مہرباں

دلوار سے ابھرے
ہمیں اِن آب و گِل کے منظروں سے کھینچ لائے
باہنر کر دے
(سیہ دن کے حصاروں سے نکالے،
معتبر کر دے)

مرے سائیں!
ترے ہونے، نہ ہونے کا گماں
اُس وقت ہوگا۔

جب ترے منظر سے ہم نظریں اُٹھائیں گے

ابھی تو ہم
ہوا میں جھولتی
تیرے سجل وعدے کی رسّی
تھام لینے (چوم لینے) کی
مسلسل کوششوں میں دیر سے سرگشتہ و ژولیدہ ہیں
سائیں ذرا اک پل کو تھوڑی ڈھیل
تھوڑی ڈھیل
تھوڑی ڈھیل......

چُپ کی شاخوں پہ کسی حرف کی کوئل بولے

لفظ آواز میں ڈھل جائیں تو جنگل بولے

بات پھُوٹے تو ہر اِک سمت مہک کھِل اُٹھے

ہونٹ سِل جائیں تو سُلگی ہوئی صندل بولے

جن رُتوں رات عزاداری کرے گلیوں میں

اُن دنوں مشعلِ نغمہ لیے پائل بولے

اِک جرس جاگے کہ پاؤں کی تھکن سو جائے

ایک بوند اترے کہ دم لیتا ہوا تھل بولے

قریۂ شب میں چلو آج صدا کر آئیں
پیشتر اس کے، کہ دیوانہ کوئی کل بولے

بولنا ہے تو سرِ محفلِ اعدا بولیں
یہ نہ ہو جائے کہ پھر آنکھ کا کاجل بولے

تیشہ بدست اگرچہ ہر اک شخص تھا کھڑا
لیکن کسی سے جبر کا پتھر نہ کٹ سکا

پیہم مسافتوں سے زباں گُنگ ہو گئی
ایک اِک قدم پہ پھر دل ہمیں بولنا پڑا

خنجر در آستیں تھے ندیمانِ راہِ شب!
کب تک کوئی ہر اس کی دیوار چاٹتا

اک لفظ کی گواہی بھی حق میں نہ جا سکی
کس درجہ زعم تھا ہمیں حرفِ آشنائی کا

ایسی تو زہریری ہوائیں چلی نہ تھیں!

پھر کیوں ہر ایک شخص یہاں منجمد ہُوا

بچھڑے ہوؤں کی یاد ستاتی تو تھی ، مگر

سب جاں بلب تھے، کون کسی کو تلاشتا

بڑھتے رہیں گے جھومتی خوشبو کے قافلے

دستِ ستم نے پھول مسل بھی دیا تو کیا!

وصال گھڑیوں میں ریزہ ریزہ بکھر رہے ہیں
یہ کیسی رُت ہے، یہ کن عذابوں کے سِلسلے ہیں

مرے خُدا، اِذن ہو کہ مُہرِ سکُوت توڑیں
مرے خُدا، اب ترے تماشائی تھک چُکے ہیں

نہ جانے کِتنی گلاب صُبحیں خراج دے کر
رسن رسن گھور اماوسوں میں گھِرے ہُوئے ہیں

صدائیں دینے لگی تھیں ہجرت کی الپسرائیں
مگر مرے پاؤں دھرتی ماں نے پکڑ لیے ہیں

یقین کر لو، کہ اب نہ پیچھے قدم ہٹیں گے
یہ آخری حد تھی، اور ہم اِس تک آ گئے ہیں

نہ آرزوؤں کا چاند چمکا، نہ قربتوں کے گلاب مہکے
نہ ہجرتوں کا عذاب سہتے ہُوئے مسافر گھروں کو لوٹے

نہ آنگنوں میں، درختِ جاں پر، وصال موسم کا بُور جاگا
نہ ڈالی ڈالی کسی پرندے نے خوشبوؤں کے ترانے چھیڑے

ورق ورق زائچوں میں تحریر ایک سے تھے جواب، لیکن
سوال چکھنے کی خام خواہش میں ہم نے کیا کیا عذاب چکھے

بس ایک ڈھلوان درمیاں ہے، اور اُس سے آگے کھلا جہنّم
نہ جانے کس پل کی ایک لغزش عذاب صدیاں سمیٹ لائے

چھیاسی

ہمیں خبر ہے، کہ اپنے گھر کے چراغ کوئی گھڑی ہیں لیکن
ہمیں یقیں ہے کہ روشنی کی نوید سُننے تلک جلیں گے

قبیلے والو اُٹھو، اور اپنا بچاؤ کرلو، کہ میں نے کل شب
فصیلِ شہرِ اماں کے باہر، نقب زنوں کے گروہ دیکھے،

ستاسی

ایّامِ اسیری میں لکھی چند سطریں

(۸۹—۹۲)

گھناؤنا جُرم

ہمارا جُرم اتنا ہے
کہ جس دن
شہر بھر میں
سگ شماری ہو رہی تھی
ہم نے
اپنا نام
فہرستِ سگاں میں کیوں نہ لکھوایا ؟ !

ایک شعر

جاگتی آنکھوں سے سُندر خواب بُننے کی سزا
زندگی لاحاصلی کی دُھوپ میں سنولا گئی

۲۷ر ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء

نوحے

میری سوچ سے زیادہ چپ اُس کمرے کی دیواریں ہیں
جس میں کچھ سرگوشیاں، یا زنجیروں کی جھنکاریں ہیں

اِک خاموشی، مایوسی کی کُجّل اوڑھ کے بیٹھی ہے
ورنہ کھڑکی سے باہر، آوازوں کی مہکاریں ہیں

قیدِ سماعت، قفل لگے اُس دروازے تک جاتی ہے
جس سے آگے ہرے درخت پہ چڑیوں کی چہکاریں ہیں

دھنک گلاب کِھل اٹھنے کے موسم کی دستک کہتی ہے
عہدِ خزاں بس کوئی دم ہے، اُس کے بعد بہاریں ہیں

حسنؔ رضا، اُس کمرے کی وہ چیونٹیاں میری ساتھی ہیں
فرش سے لے کر چھت تک جن کی لاتعداد قطاریں ہیں

۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۲ء

اسیر لمحوں میں ایک خواہش

وہ بھی کیا دِن تھے
کہ جب شاخِ تمنّا پہ مری
وصل ساعت کے دھنک رنگ میں ڈوبے ہُوئے
گُل کھِلتے تھے

اور اب یُوں ہے
کہ تُو ہے، نہ ترا چہرہ، نہ رخسار نہ ہونٹ
فقط اک درد کا لمحہ ہے
جو سب قُرب کے لمحوں پہ گراں ٹھہرا ہے
دل تو کہتا ہے کہ تجھ سے سبھی باتیں کہہ لُوں
تیرے ہونٹوں پہ
ترے ریشمی گالوں پہ کوئی نظم لکھوں
تیرے ہاتھوں کی حنا
ہونٹوں کی زینت کر لوں
دل تو کہتا ہے
کہ دو پنکھ لگیں، اور میں اُڑ کر تجھے چھُو لوں
لیکن ......
کیا کروں پاؤں کی زنجیر چھنک جاتی ہے

۲۹ ستمبر ۱۹۸۲ء

ویراں شود آں شہر....

وہ شہر
جس کی کنواریوں کے گلاب پیکر
اصیل خواجہ سراؤں کے
بے صفات جسموں سے منسلک ہوں!

وہ شہر، جس میں
بدن کا سونا
رفاقتوں کی بجائے
سورج کی حدتوں سے پگھل رہا ہو!

وہ شہر
جس میں صداقتوں کو شہید کرنے
قدم قدم پہ
ستم صلیبیں گڑی ہوئی ہوں!

جہاں جہالت،

ذکاوتوں سے خراج مانگے!

تو ایسے شہرِ عظیمِ جاں کو
تباہ ہونے سے
کوئی
کیونکر بچا سکے گا!؟

ستم تو یہ ہے .....

...... ستم تو یہ ہے
کہ دستِ کوزہ گراں میں کوئی ہنر نہیں ہے
وگرنہ جوہر بلا کے
چاکوں پہ گھومتی،
اور خاک اُڑاتی سفال میں تھے

وہ اسمِ اعظم
جو زیرِ سنگ آمدہ
دُکھی ہاتھ کی رہائی کا گیت بُنتا
کسی کو از بر کہاں
کہ وردِ زبان ہوتا

سو ہم نے دیکھا
کہ شہرِ حاتم میں
عُشر در عُشر
کرچی ہوتی انائیں

بوسیدہ آرزوئیں
لباسِ دریوزہ گر میں سمٹی
زکوٰۃ زادوں کی خاکِ دہلیز چاٹتی تھیں
یہ ہم نے دیکھا !!

یہ حشر لمحہ بھی ہم نے دیکھا
کہ توشہ دانوں میں لفظ لاشے اٹھائے
سینے پہ بے حسی کے نشاں سجائے
"غرورِ اہلِ قلم"
صفِ جاہلاں میں
خم گردنیں کئے مطمئن کھڑے تھے !
ستم تو یہ ہے ..... !

ہر ایک چہرے پہ کندہ حکایتیں دیکھو

پسِ حروف نہاں ہیں جو نفرتیں دیکھو

جو اہلِ دِل ہو، تو تنویرِ آگہی کے لیئے

بجھی نگاہوں میں تحریر آیتیں دیکھو،

رگوں میں کھولتے خوں کی قسم نہ کھاؤ کبھی

گداز جسموں میں پنہاں صلابتیں دیکھو

برونِ خانہ بہت یورشیں سہی، لیکن،

درونِ دِل جو اُٹھیں وہ بغاوتیں دیکھو

نئی رُتوں کا ہر اک نقش بولتا ہے، مگر
گئی رُتوں نے تراشیں جو صُورتیں، دیکھو

جو ہو سکے تو کبھی تپتی شاہراہوں پر
ٹپکتے خون سے لکھی عبارتیں دیکھو

لبوں پہ مہرِ خموشی کے باوجُود رضاؔ
گذر رہی ہیں جو اندر قیامتیں دیکھو

دیوار کی صورت سنتے رہو، اک لفظ نہ اپنے منہ سے کہو، خاموش رہو

یہ پل دو پل کی رات تو ہے، کٹ جائے گی آخر ہمسفرو، خاموش رہو

جب اذنِ تکلّم چھن جائے، جب حرف و قلم پر قدغن ہو، ایسی رُت میں

مفہوم سے عاری لفظوں کی اہمیت کو تسلیم کرو، خاموش رہو

بے داد گروں اور قاتلوں کے سنجوگ پہ اتنی حیرت کیوں، یہ ہوتا ہے

لیکن باوصفِ بوالعجبی، تکریم میں سب سر خم کر لو، خاموش رہو

مقتل کی تیرہ جبینوں سے، گلرنگ سویرا پھوٹے گا، سب دیکھیں گے

ہاں شب کے پرستاروں کو مگر دو چار گھڑی کھُل کھیلنے دو، خاموش رہو

ادھورے موسموں کا ناتمام قصہ

یہ کون جانے
کہ کل کا سورج
نحیف جسموں، سلگتی رُوحوں پہ
کیسے کیسے عذاب لاتے،
گئی رُتوں سے جواب مانگے
نظر نظر میں سراب لاتے
یہ کون جانے!

یہ کون مانے
کہ لوحِ احساس پہ گئے موسموں کے جتنے بھی
نقش کندہ ہیں
سب کے سب
آنے والی ساعت کو آئینہ ہیں
جو آنکھ پڑھ لے
تو مرثیہ ہیں۔

سو

یہ کون دیکھے، یہ کون سمجھے

کہ صبحِ کاذب کی بارگاہوں میں سر بسجدہ امین چہرے

گرای مسافت پہ پاؤں دھرنے سے پیشتر ہی

گراں نقابیں الٹ رہے ہیں

رہِ ریا کو پلٹ رہے ہیں

یہ کون سمجھے، یہ کون جانے !!

شامِ غریباں

بہار کے اولین، نامہرباں لمحو !

جواب دینا

وہ کون ساعت تھی

کیا گھڑی تھی

کہ جب بلائے سموم و صرصر نے

ایستادہ صد اقتوں کا گلاب گلشن اجاڑ ڈالا

وہ کون پل تھا

جواب دینا۔

ردائے شب پر چمکتے تارو !

جواب دینا

کہ کس قیامت کی رات تھی

کیا عناد لمحہ تھا

جب ستم کا تبر مرے چاند پر لگا تھا

کہاں کہاں کرچیاں مرے چاند کی گری تھیں

یہ سانحہ تم نے کیسے دیکھا

گمان رکھنا

جواب دینا

اذیت و ظلم، کور آنکھوں سے دیکھتی

اے خموش مٹی

جواب دینا

کہ کیسی سج دھج سے

حوصلے سے

وہ چاند میرا سوئے صلیبِ وفا چلا تھا۔

قدم قدم اُس کا نقش کیا کہہ رہا تھا

کیسی شجاعتیں،

کیسا طنطنہ تھا،

گواہ رہنا

جواب دینا

فراق رُت کی الم ہواؤ!

جواب دینا

کہ دار پر طوق در گلو

کیا کلامِ آخر کیا تھا اُس نے

نفس نفس کس کے نام تھے

سب سلام اُس کے

پیام اُس کے
گمان رکھنا
یہ ماتمِ گُل کی لمحہ لمحہ امانتیں ہیں۔
امین ہو تم
سنبھال رکھنا،
جواب دینا۔

غرض، مکینانِ عرش تا فرش
دھیان رکھنا
کہ منتقم موسموں نے تم سے
ہر اک گھڑی کا حساب لینا ہے
یاد رکھنا،
جواب دینا۔

ابھی تو پورے پروں سے اُٹھّے نہ تھے کبُوتر
کہ خون میں تر بتر زمیں پر گرے کبوتر

بس ایک دہشت کی باڑھ جاگی کھلی فضا میں
پھر اس کے بعد آنکھ میں نہ دیکھے گئے کبوتر

وہ شِکرا شکرا گھڑی میں ڈھلتے عقاب دن تھے
جب اپنے سائے سے آپ ڈرنے لگے کبوتر

کُھلے میں اُڑنے کی آرزوئیں مری نہیں تھیں
یہ کابکوں میں اسیر تھے پَر کٹے کبُوتر

وہ دانہ و دام ہی بہت خوشنما تھے شاید
جبھی تو اپنی رضا سے قیدی ہوئے کبُوتر

سوچ البم پر سجے ہوئے تھے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے
اسی لیے تو یاد بھی آئے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

اب وہ سجرے باغ، وہ روشن گلیاں، وہ بازار نہیں ہیں
اب کس نگری سے لائیں گے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

کیا مستانے موسم تھے، جب بن مانگے ہی مل جاتے تھے
رنگ برنگے لٹو، کنچے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

جب مرا گڈا شہزادی کی گڑیا بیاہ کے گھر لایا، تو
اُس نے داج میں بھجوائے تھے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

ایک سوچ

من کا مورکھ بچہ ضِد پر اڑا ہوا ہے، لیکن اک دن
سو جائے گا مانگتے مانگتے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

جب وہ عمر، وہ موسم اور وہ سنگی ساتھی نہیں رہے، تو
حسن رضاؔ، کیا ان کے کرو گے، تتلیاں، جگنو اور کھلونے

سوچ شجر سے، سُکھ حسرت کا آخری پتّا ٹوٹ گیا
خواب کنول کھِلنے بھی نہ پائے، شب زنجیرا ٹوٹ گیا

غم بارش میں آس محل کی سب دیواریں بیٹھ گئیں
دُکھ ریلے میں اُمّید دل کا شہ دروازہ ٹوٹ گیا

ایک اِک کر کے شہزادی نے سارے ناطے توڑ لیے
رفتہ رفتہ ٹوٹ بکھر جانے کا سِلسلہ ٹوٹ گیا

خوف رُتوں ہم دل دروازے بند کیے بیٹھے تھے، مگر
ایسا حبس بگولا اُٹھا، جسم گھروندہ ٹوٹ گیا

اب کہ برس چاندی بدنوں کا شہر میں ایسا کال پڑا
چہرے دیکھنے کی حسرت میں شوق آئینہ ٹوٹ گیا

کیا رکھا ہے وصل کی لمبی راتاں میں عباس رضا
دھرا ہے کیا اب گگئے دنوں کی باتاں میں عبّاس رضا

لد گئی وہ رُت جب شہنائیاں گیت ملن کے گاتی تھیں!
اَب تو نوحے سنتے ہیں باراتاں میں عبّاس رضاؔ

کس کو اپنا یار سمجھتے، کس کو زخم دکھاتے ہم!
پیار کے دشمن بیٹھے ہوں جب گھاتاں میں عبّاس رضا

اُس دروازے پر جا تم نے دی ہے دستک جس کے مکیں
زہر ملا کر دیتے ہیں خیراتاں میں عبّاس رضا

خوش قسمت وہ لوگ ہیں جن کو تپتی رُت راس آتی ہے
تم تو جل کر راکھ ہوئے برساتاں میں عبّاس رضا

کیسے پیار سے گلے لگایا، کیسے پوچھا تھا احوال
نفرت لپٹی تھی جن کی سوغاتاں میں عبّاس رضا

مان لے اب بھی حسن کا کہنا چھوڑ حنا کی خوشبو کو
دشنۂ سم ہے مہندی والے ہاتاں میں عبّاس رضا

ایک سو دس

جس پہ چار قدم چل کر شہزادی جائے
ایسے رستے کی توقیر بڑھا دی جائے

جسم خزانوں کی اشرفیاں چُن لینے میں
حرج نہیں گر ساری عُمر بتا دی جائے

تاجِ شہی کے خواب اگانے والوں کو بھی
قتل گھوں کی ایک جھلک دکھلا دی جائے

حرم سرا کے بھید مُبادا کُھل کُھل جائیں
روزن روزن جاگتی آنکھ بجھا دی جائے

شہ درّوازوں پر جب خوف استادہ ہو تو
کس بِر تے پھر آس محل فریادی جائے

کون گھڑی تقدیر قبیلے کی بدلے گی
جانے کون سمے گھر سے بربادی جائے

گھٹنوں کے بل چلنے والے بچوں کو بھی
رخشِ صبا رفتار کی باگ تھما دی جائے

ایک نظم

گداگرانِ قلم کاسۂ سخن لے کر
خمیدہ سر، درِ بوجہل پر ستادہ ہیں
یہ کور ذہن لٹا کر متاعِ عصمتِ حرف
اسی پہ خوش ہیں کہ دریوزگی تو راس آئی

یہ کلکِ حرف کے وہ شہ غلام زادے ہیں
جو اپنے رختِ سفر میں ضمیر اور قلم
گھروں سے لائے، مگر راستے میں چھوڑ آئے
مبادا طبعِ شہہ عصر پہ گراں گذرے

ایک سوت یرہ

یہ کم نظر، یہ شعورِ لباس سے عاری
قبائے جرم پہن کر بھی کتنے نازاں ہیں
یہ خوش نصیبیٔ بوجہل ہے کہ اب کے بھی
سخنورانِ سبک سر بہت ہی ارزاں ہیں

یہ بد نصیبیٔ اہلِ قلم سہی، لیکن
ہمیں یہ فخر، کہ کچھ سر کشیدہ باقی ہیں
جو حرفِ حق و صداقت کا پرچم پرّاں
کسی مزار کی زینت نہیں بنائیں گے

"گریزد از صفِ ما، ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلۂ ما نیست"

جالب کے نام

بزدلِ رات کے مُکھ پر روشن ایک دیا ہے اور وہ تم ہو
حبس رُتوں میں ایک ہی پرچم کھُلا ہوا ہے، اور وہ تم ہو

چپ کی چادر تان کے سونے والے بہت ہیں اور وہ ہم ہیں
گونگے شہر میں دستک دیتی ایک صدا ہے، اور وہ تم ہو

شہرِ منافق کے ہر شخص کے ہاتھ میں زہر بجھا اِک خنجر
اور ان سب کا ایک ہدف (انمول انا) ہے، اور وہ تم ہو

جھوٹ کا پربت کاٹنے والے اپنے تیشے پھینک چکے ہیں
لیکن آہنی عزم لیے اک شخص کھڑا ہے، اور وہ تم ہو

ہم سب کب کے مصلحتوں کے دام میں بے سُدھ پڑے ہوئے ہیں
اب تو دشت میں ایک ہی آہو نے رم خوردہ ہے، اور وہ تم ہو

شاعر

صداقت کی راہیں اگرچہ کڑی تھیں
ہر اک گام پر مصلحت کے تقاضے،
سبھی راستوں پر
ستم موسموں،
بے جہت ساعتوں کی صلیبیں گڑی تھیں
مگر جراءتوں کا سرافراز پرچم
کبھی میرے شاعر کے دستِ صداقت سے گرنے نہ پایا
نہ پاؤں میں لغزش
نہ دِل ڈگمگایا

وہ جبّوں پہ جہد و تمرّد کے بے داغ تمغے سجائے
ہر ایوانِ آمر میں تنہا لڑا ہے
وہ اب بھی صفِ قاتلاں کے مقابل
اکیلا کھڑا ہے

نہ اس نے ریاکار، بدعہد، اور کم نسب حاکموں کی طرف

کوئی دستِ رفاقت بڑھایا
نہ پیمان باندھا
نہ حرفِ وفا
مصلحت کیش ساعت کے چرنوں میں رکھا
نہ تاجِ شہی پر قصیدہ سجایا

نہ اس نے کبھی
شہر یاروں کی تکریم و توقیر میں
حرفِ توصیف کے کاغذی پھول وارے
نہ تعریف لکھی

وہ صدق و صفا کا پھریرا اٹھائے
ستم چوٹیاں زیر کرنے کے دشوار و مشکل سفر پر
اکیلا گیا ہے

وہ پختہ ارادوں کی
سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار ہے، اور اس کے
بدن پر جواں حوصلوں کی زرہ ہے

ستم موسموں جب مرے شاعروں
میرے دانشوروں کی زبانوں پہ چپ کے

زنگ آلودہ قفلِ گراں چھولتے تھے
تو اُس نے لکھا تھا،

"قلم سرخرو ہے
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازو سناں تولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے،
زلیست کی آبرو ہے،
قلم سرخرو ہے۔"

وہ ہونٹوں سے بہتے ہوئے لفظ
یا لوحِ قرطاس پر
جگمگاتے ہوئے ایک اک حرف کو
معتبر جانتا ہے
کہ تکریم حرف و قلم
اس کا سرمایۂ عمر ہے

وہ شاعر ہے
اور حرفِ صدق و صفا کو
ریاضت کی اک
انتہا جانتا ہے
خدا مانتا ہے۔

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے

وطن بدر کسی دشمن کو بھی خدا نہ کرے
کہ اپنا گھر، گلی کوچے، فصیل، بام اور سقف
مثالِ جنتِ گم گشتہ یاد آتے ہیں
وہ شہرِ قاتل و دلدار، جس کے رستوں پر
بدن دریدہ اسیرانِ پا بجولاں نے
تمام عمر گذرنے کی خواہشیں کی تھیں
اُسی بلادِ تمنّا کی مہوشوں کے نام
سلامِ یارِ دل آزردہ کا پیام لیے
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے"
اور ایک بار نہیں، بار بار گذری ہے
"تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گذری ہے

۲

بنامِ یارِ غریب الدّیار لکھیں گے
کہ جو ستم کسی قاتل صفت کی قسمت تھے
ہر اک گھڑی، وہ ستم ہم پہ ڈھائے جاتے ہیں

کبھی جو تذکرۂ لیلٰئے وطن چھیڑیں
تو ہم پہ کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں
صلیبِ شہر تو خوں رنگ ہو چکی، لیکن
خطیبِ شہر کے ارماں ابھی ادھورے ہیں
لبوں پہ مہرِ خموشی، قلم پہ قدغن ہے
جو حرفِ حق و صداقت زباں پہ لائیں
تو شہرِ یار کی چتون پہ گرہیں پڑتی ہیں
مگر قلم کی قسم، ہم سے سر پھروں نے کبھی
کسی یزید صفت کو نہ معتبر جانا
نہ دستِ غاصب و قاتل پہ ہم نے بیعت کی
نہ تخت و تاجِ شہی پر کوئی قصیدہ لکھا
جو منظر آنکھ نے دیکھا، رقم کیا ہم نے
"اگرچہ دِل پہ خرابی ہزار گذری ہے
اور ایک بار نہیں، بار بار گذری ہے
تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گذری ہے"

۳

کتاب و حرف کے ساونت پاسبانو، لکھو
لکھو کہ حرفِ صداقت کبھی نہیں مرتا!
لکھو کہ جاگتی آنکھوں میں خواب زندہ ہیں
لکھو کہ پرچمِ پرّاں کبھی نہیں جھکتا!

کہو کہ اپنا قلم ہم کبھی نہ بیچیں گے
لکھو کہ ہم نہ کریں گے ضمیر کا سودا
کہو کہ تیرِ ستم ہو، کہ دشنۂ یاراں
"جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں"
کہو کہ مے بھی میسّر تھی، گل بھی تھے، وہ بھی
پر ایک سبز قدم شیرک کی دہشت سے
"عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے"
چمن چمن سے صبا سوگوار گزری ہے
"تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے"

(فیض صاحب کی سترھویں سالگرہ پر پڑھا گیا)

اپنے ہونے کا کیونکر دلائیں یقیں،
ہم ابھی تک گمانوں سے نکلے نہیں

دو گھڑی کی رفاقت تھی، اور لڑکیاں
رقص کرتے ہوئے خواب بننے لگیں

جانتی تھیں، کہ سپنے بکھر جائیں گے
پھر بھی پاگل ہوا سے لپٹتی رہیں

دوڑتے دوڑتے سب سے بچھڑے، مگر
تتلیاں خواہشوں کی نہ ہاتھ آسکیں

کتنی نامہرباں تھیں وہ گھڑیاں حسن
اپنی پہچان کی جب پتنگیں کٹیں

گئے دنوں کی بات ہے جب میں بچہ تھا
پریوں سنگ اُڑنے کی خواہش کرتا تھا

چاند نگر پر محل بنانے کی ضد میں
اکثر ماں سے جھگڑا کرتا رہتا تھا

آج پرانی البم دیکھ کے یاد آیا!
میں کتنا معصوم اور بھولا بھالا تھا

گلیوں گلیوں دھوم تھی تیرے آنے کی
آنگن آنگن تیرے نام کا چرچا تھا

اُس شب اپنے اجڑے کمرے میں آ کر
میں نے تیری تصویر کو روتے دیکھا تھا

تجھ کو دیکھے عُمریں گذر گئیں، لیکن
یوں لگتا ہے، جیسے کل ہی بچھڑا تھا

جتنے خواب گلاب کھِلے، سب تیرے تھے
اور جو سپنا ٹوٹ گیا، وہ میرا تھا

مِلن رُتیں سب تیرے نام الاٹ ہُوئیں
ہجر کا قرعہ میرے نام کا نکلا تھا

گئی رُتوں کی تھکن بدن سے لپٹی تھی
اور پاؤں میں نئے سفر کا نقشہ تھا

محسن رضا ہم ایسے خواب اسیروں کا
کب ہنستی تعبیروں نے منہ چُوما تھا

ستارہ زمیں پر اُترتا نہیں

ہم سیہ بخت ایسے
کہ ہاتھوں کی ریکھاؤں پر چاند اترنے کی خواہش لیے

در بدر
عمر بھر اک سفر میں رہے۔
وہ سفر، جس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا
کوئی منزل نہ تھی
کوئی رستہ نہ تھا

اک تمنّا، اک اُمیّد پہ اس سفر کے
کڑے کوس کاٹے
کہ شاید کبھی
کوئی منزل قدم چُومنے آئے گی
کوئی رستہ
قدم میں قدم ڈال کر
خواہشوں کے گل آنگن میں لے جائے گا ——

—— خواہشوں کا وہ آنگن
کہ جس میں ہر اک سمت
پھولوں کی مہکار جلنے کا اک استعارہ بنے
ہاتھ ریکھاؤں پر
خوابِ تقدیر کا اک ستارہ جگے
اک سہارا کھلے ——!
وہ سہارا،
وہ روشن ستارہ جسے
ہم نے چاہا کہ اک دن
صبا کے ہنڈولے میں
خواہش کے ڈولے میں
سُونے گھر آنگن جو اترے
تو ہم کہہ اٹھیں —— آج سب
خواب پورے ہوئے
رنگ دُونے ہوئے
شوق گوڑھے ہوئے ——
—— پر ہمیں کیا خبر تھی
کہ اوجِ فلک پر چمکتا ستارہ
ہمارا نہیں۔

ایک سو چھبیس

روشنی بانٹتا استعارہ نہیں ——

—— وہ ستارہ سمجھتا تھا جیسے زمیں سے

کوئی شاہزادہ

ہواؤں کے رتھ پر سوار آئے گا

اور چمکتی ہوئی کہکشاؤں کے رستے

اُسے اپنے آنگن میں لے جائے گا ——

—— پر زمیں پہ اُسے چاہنے والا، تو

عام سی شکل و صورت کا

اک شاعرِ بے زر و مال تھا

شاہزادہ نہ تھا —— !

پھر بھی اُس شاعرِ بے زر و مال کو

اپنے سپنے بکھرنے کا،

دل ٹوٹ جانے کا غم تو نہیں

پر اُسے ایک دُکھ ہے۔

کہ اوجِ فلک پر چمکتے ستارے کے

سارے بھرم

کرچی کرچی ہوئے

ریزہ ریزہ ہوئے

فون پہ اُس کی باتیں، اُس کے قہقہے اچھے لگتے ہیں
پل دو پل کے سہی، مگر یہ رشتے اچھے لگتے ہیں

رنگ جگاتے جملوں سے لگتا ہے، جیسے اُس کو بھی
کھٹی میٹھی باتیں کرتے لڑکے اچھے لگتے ہیں

ہمیں خبر ہے سب تعبیریں ہاتھ نہ آتی پریاں ہیں
پھر بھی جاگتی آنکھوں دیکھے سپنے اچھے لگتے ہیں

موتیوں والے مکھڑے بھی اپنے احباب میں شامل ہیں
مگر ہمیں تو خوش خط سانولے چہرے اچھے لگتے ہیں

ہم دونوں ستانوں کی اِک خواہش ملتی جلتی ہے
مجھ کو شہزادی، اُس کو شہزادے اچھے لگتے ہیں

حسن رضا آخر ایسی کوئی خوبی ہوگی، جس کے سبب
شہر کی ماہ جبینوں کو ہم اتنے اچھے لگتے ہیں

کانچ کنواری عمروں کو جب مٹی میں رُل جانا ہے
پھر کیوں رضاؔ یہ لمحہ بھر کے میلے اچھے لگتے ہیں

چھاجوں برستی بارش کے بعد

رفاقت کے نشے میں جھومتے
دو سبز پتّوں نے
بہت آہستہ سے تالی بجائی
اور کہا :
"دیکھو حسن عباس !
اتنی خوبصورت رُت میں
کوئی اس طرح تنہا بھی ہوتا ہے
جو تم اس طور تنہا ہو" !؟

یہ کہہ کر دونوں اک دُوجے سے یوں لپٹے
کہ جیسے ایک دِن تُو مجھ سے لپٹی تھی
...... اُسی لمحے
مرے ہونٹوں پہ تیرا شہد آ گیا
لمس جاگ اُٹھا
اور اُس گم گشتہ نشّے کو میں ہونٹوں پر سجائے
اپنے کمرے میں چلا آیا
کہ دفتر کا بہت سا کام باقی تھا۔

مہتاب چنہؒ کے لیے

سنو مہتاب چنہؒ !
تمہیں اپنی ذہانت
اور ہنسی پر مان ہے —
اور تم سمجھتی ہو
کہ ہنسنا، اور ہنسانا ایک فن ہے۔
ہو گا ——— لیکن
اب ہمارے ہاں
کچھ ایسے برگزیدہ لوگ بھی ہیں
جو کہ ہنستے اور ہنسانے والوں کو
ابرو کی اک جنبش سے
پل بھر میں رُلا دینے پہ قادر ہیں !

تو پھر تم ہی کہو مہتاب چنہؒ
وہ بڑے فن کار ہیں ——— یا تم ؟ !

بیٹیاں، جیسی بھی تھیں، ماں کو لگیں شہزادیاں
یہ بجا، لیکن وہ قسمت کی نہ تھیں شہزادیاں

جانے خواہش کی براتیں کون دریا لے گئے
سوچ دروازوں میں تکتی رہ گئیں شہزادیاں

جسم کی چاندی سفر کرتی سروں تک آگئی
اب ملن رُت کا کریں کیسے یقیں شہزادیاں

قصرِ خواہش پر کمندیں ہم نے ڈالی تھیں، مگر
خواب محلوں سے نہ باہر آسکیں، شہزادیاں

آس آئینوں پہ اِک پتھر گرا، پھر عُمر بھر
کرچی کرچی خواہشیں چُنتی رہیں، شہزادیاں

ہم سُخن کی سلطنت کے شاہزادے ہیں رضاؔ
شاعری کے روپ میں ہم کو ملیں شہزادیاں

ایک سو تینتیس

رگوں پر برف سی جمنے لگی ہے، رُوح کی شہزادگی کم ہو رہی ہے،
نظر میں جھلملاتے ماہ دانجم بجھ رہے ہیں، روشنی کم ہو رہی ہے

تعلّق کی وہ شاخِ سبز، جس پر پھُول کھلتے تھے، سیہ ہونے لگی ہے
مروّت کی جو تھوڑی سی مہک آتی تھی، اب وہ اور بھی کم ہو رہی ہے

دریچوں سے پرے جتنے مناظر تھے، وہ رفتہ رفتہ دھندلانے لگے ہیں
دریچوں سے اِدھر آنکھوں کی شمعوں میں مچلتی زندگی کم ہو رہی ہے

زمانہ ہو گیا لیکن بچھڑنے والا آنکھوں سے پرے ہٹتا نہیں ہے
اگرچہ اُس کی تصویریں ہٹا دی ہیں، اور اُن سے "دوستی" کم ہو رہی ہے

ایک سو چونتیس

کبھی جی چاہتا ہے موت کو بھی تحفۂ جاناں سمجھ کر گھر میں رکھ لیں

کہ اَب تو یہ زندگی بوڑھی ہوئی جاتی ہے، اس میں دلکشی کم ہو رہی ہے

حسن جاں، اپنے کیسۂ شب میں کوئی جگنو، کوئی تارا نہیں ہے

فقط یادوں کا ڈھلتا چاند باقی ہے، اور اُس کی چاندنی کم ہو رہی ہے

میں خوشبو کی طرح ہوں، کیسے رکھو گے نہاں مجھ کو
اڑا لے جائے گی اک دن ہوائے مہرباں مجھ کو

یہ کیسی سرحدِ جاں پر اچانک آ گیا ہوں میں
کہ گھیرے میں لیے جاتا ہے نیلا آسماں مجھ کو

ابھی تک پاؤں الجھے ہیں رکابوں میں، خدا جانے
یہ سرپٹ دوڑتا لمحہ گرائے گا کہاں مجھ کو

بتائے کون، کیسی ابتدا تھی انتہاؤں کی!
کہاں پر ختم کرنی ہے اب اپنی داستاں مجھ کو!

کوئی اڑیل کرایہ دار آئے اور رہ جائے
کہ اب خالی ہی کرنا ہے یہ آسیبی مکاں مجھ کو

حسنؔ میں نے غزل میں موت کی وہ میناکاری کی
کہ برسوں یاد رکھے گا ہر اِک تاریخ داں مجھ کو

آثارِ قدیمہ سے نکلا ایک نوشتہ

ہماری آنکھ میں نوکیلے کانٹے
اور بدن میں
زہر کے نیزے تراز و ہو چکے تھے
جب سیہ شب نے
گلابی صبح کے غرقاب ہونے کی خبر پر
ہم سے فوری تبصرہ مانگا ——

ہمارے ہونٹ
اتنے خشک،
اور اتنے دریدہ تھے
کہ ہم اک لفظ بھی کہتے
تو ریزہ ریزہ ہو جاتے

قلم ہاتھوں میں کیا لیتے
کہ اپنے ہاتھ پہلے ہی قلم تھے۔

(کیا سُخن کہتے
کہاں لکھتے، کیسے لکھتے) ؟

سواہلِ جاہ نے
جو تبصرہ (جو قتل نامہ) سامنے رکھا
ہم اہلِ صبر نے
خوں رنگ ہونٹوں کی دریدہ مُہر
اُس پہ ثبت کر دی

گھرا جاتا ہے تاریکی میں سارا شہرِ جاں آہستہ آہستہ
ہمیں ڈر ہے کہ ہٹ جائے گا سر سے آسماں آہستہ آہستہ

بسیرہ مکڑی کے جالے کھڑکیوں سے اب تو دیواروں تک آ پہنچے
کہیں خالی نہ ہو جائیں مکینوں سے مکاں آہستہ آہستہ

ہماری آرزوئیں جس کی بنیادوں میں اب تک سانس لیتی ہیں
ہمیں پر گر رہی ہے اب وہ دیوارِ اماں آہستہ آہستہ

اگر دہشت کا سورج اور کچھ دن یوں سوا نیزے پہ ٹھہرا ، تو
عجب کیا ہے کہ جسم و جاں سے اٹھے دھواں آہستہ آہستہ،

یقیں کا زادِ رہ سینوں میں زندہ ہو تو غم کیا دھوپ موسم کا
گذر جائے گا دشتِ لُو سے اپنا کارواں آہستہ آہستہ

ایک دُعا

داتا دربار میں

جاگتی آنکھوں دیکھے سارے خواب مکمل کر دے
داتا میری جھولی بھر دے

تقدیروں کی شاخ پہ کھلتی کلیاں، پھول بنا دے
داتا سوئے بھاگ جگا دے

کب تک لگی رہیں گی آنکھوں میں ساون کی جھڑیاں
داتا بھیج ملن کی گھڑیاں

ہنستی گاتی پائل کی آواز کا نرم دلاسہ
داتا خواب بُنے رقاصہ

ہر آنگن دو شالے اوڑھے، گُل پریاں لہرائیں
داتا ہم خوشبو ہو جائیں

اندھی رات کے مکھ سے پھوٹیں سُورج چاند سنہرے
داتا ٹوٹیں خوف کے پہرے

ڈرا ہوا اک شخص ہوں، مجھ پر بھیج کرم کا سایہ
داتا در پہ تیرے میں آیا

ماتم، ماتم

دشتِ بلا کی کوکھ سے پُھوٹا پہلا ماتم
اَبد گھڑی تک نامِ حسینؑ پہ ہوگا ماتم

پھر نظروں میں نہر فرات کے منظر جاگے
پھر اشکوں کی صُورت آنکھ سے برسا ماتم

لختِ جگر کی لاش پہ بھی ممتا نہیں روئی
کب دیکھا ہے چشمِ فلک نے ایسا ماتم

خواہش۔ چاند سے چہرے پر اک سہرے کی تھی
قسمت۔ جلتے خیمے، لہو، جنازہ، ماتم

پاؤں برہنہ بیبیاں تھیں، اور شام کی گلیاں
شہر کے ہر دروازے پر کندہ تھا ماتم

عابد سے بیمار کے پاؤں میں زنجیریں
اور زنجیر کے ہر حلقے میں برپا ماتم

شہرِ طرب کی ساری فصیلیں نوحہ کناں ہیں
گلیوں گلیوں شامِ غریباں، گریہ ماتم

"خواب عذاب ہوئے" کے عنوان سے حسن عباس رضا نے اپنا پہلا مجموعہ شائع کیا ہے۔ آپ نے مختلف اصناف اور مختلف پیرایوں میں اپنے افکار و جذبات سے عمدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور ان سب تجربات میں تنوع کے ساتھ ساتھ خلوصِ جذبات اور صداقتِ فکر کا یکساں اظہار بھی نمایاں ہے جس سے یہ توقع ضرور کی جاسکتی ہے کہ اس خوبصورت نقشِ اوّل کے بعد ان کی مزید کاوش انتظار کے قابل ثابت ہوگی۔

۱۴ر نومبر ۱۹۸۴ء